پاکستان مسلم لیگ (ق) کے دورِ حکومت میں سردار نواب اکبر بگٹی کی مزاحمت: بلوچستان میں ہونے والی مزاحمتوں کا تاریخی جائزہ

عابدہ بیگم *

ABSTRACT:

Baluchistan is the largest province of Pakistan by area and it is enriched in natural resources and minerals. It is very important accordingly to geo-political and economics basis. For last 50 years people of Baluchistan are facing disintegration, it faced more than five resistances and these resistances were due to policies of Government of Pakistan and attitude of Baloch Sardar's (Tribal leaders).The last resistance was between the Government of Muslim league (Quaid-e-Azam) and Sardar Akbar Buggtti in which he was killed as a result of clash. These resistances are made for acquiring the right of empowerment and the struggle of freedom, in which external involvement cannot be ignored.

Critical condition of Baluchistan is because of wrong polices of government's, military operations that is why people and Sardars of Baluchistan are not satisfied. On the other hand, the Sardar's of Baluchistan and elected members of assemblies are not doing for betterment of life of the dwellers masses nor any development is in progress. Another reason of the uncertain condition is the involvement of foreign factors, e.g. Indian RAW.

Keywards: Baluchistan, Resistances, Muslim League (Q).

بلوچستان اپنے جغرافیائی حالات اور قدرتی وسائل کے باعث خطے میں اہمیت کا حامل ہے لیکن جب بلوچستان کا نام آتا ہے تو سب سے پہلے مفلوک الحالی اور غربت زدہ علاقہ کا تصور ذہن میں اُبھرتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ بلوچستان جبر اور عدم توجہی کا شکار رہا بلوچ عوام اپنے جائز حقوق کے حصول کے باعث باغی اور غدار کہلائے (اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ خطۂ بلوچستان میں قدرتی وسائل کی بہتات نے یہاں پر ہمیشہ طاقت کے توازن کو بگاڑ کر رکھا ہوا ہے۔ بلوچوں میں اس خطہ میں وسائل کی آگہی نے اپنے صوبے کی محافظت کا جذبہ پیدا کیا جس کی وجہ سے وفاقِ پاکستان اور بلوچی عوام میں ٹکراؤ کی صورت حال پیدا کردی)۔ اس سے پہلے وہ صرف پاکستان سے علیحدگی اور آزاد ریاست کی جنگ لڑ رہے تھے لیکن اب ایسا نہیں اب وہ اپنے صوبے کے قدرتی وسائل کی مکمل رائلٹی کے ساتھ صوبے کی خودمختاری چاہتے ہیں۔

* ریسرچ اسکالر: شعبہ سیاسیات، جامعہ کراچی　　برقی پتا: abee_gr8@gmail.com

تاریخ موصولہ: ۲۵/۵/۲۰۱۶ء

بلوچستان کو جغرافیائی اعتبار سے تین حصوں میں تقسیم کیا گیا جس میں ایک حصہ افغانستان میں سیستان اور چاکنسور کے نام سے مشہور ہے۔ دوسرا بڑا حصہ جو ایران میں 'سیستان و بلوچستان' کے نام سے ہے ان دونوں ممالک میں واقع خطوں کو مغربی بلوچستان بھی کہا جاتا ہے جبکہ پاکستان میں واقع خطہ کو دستور پاکستان کے حوالے سے 'صوبہ بلوچستان' کے نام سے پکارا جاتا ہے(۱)۔ صوبہ بلوچستان یا مشرقی بلوچستان کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو ادراک ہوتا ہے کہ صوبہ بلوچستان تاریخی اعتبار سے پاکستان کے دیگر وفاقی حصوں سے ازحد مختلف اور ممتاز ہے پاکستان کے دیگر اکائیوں کے برعکس بلوچستان جغرافیائی وثقافتی طور پر جنوبی ایشیاء یا برصغیر کا حصہ محسوس نہیں ہوتا بلکہ جغرافیائی طور اس صوبہ کا تعلق سطح مرتفع ایران (مشرق وسطیٰ) سے معلوم ہوتا ہے جس کو دریائے سندھ و گومل اور کوہ سلیمان و کیرتھر کے پہاڑی سلسلہ نے جنوبی ایشیاء سے جدا کر رکھا ہے(۲)۔ کسی حد تک مشرقی بلوچستان کی ثقافت بھی ایران سے ملتی ہے جیسے بلوچی زبان کا تعلق ایرانی زبان کے خاندان سے ہے جبکہ وفاق پاکستان میں بیشتر زبانوں کا لسانی تعلق برصغیر پاک و ہند سے ہے۔ اسی طرح بلوچ قوم یا اس کے قبائل کی ثقافت، رسم و رواج اور لباس وغذا وغیرہ خلیج فارس میں بسنے والے بدو قبائل سے ازحد مماثلت رکھتی ہے(۳)۔ مشرقی بلوچستان اپنے قدرتی وسائل کی وجہ سے اہمیت کا حامل ہے اس کے مجموعی رقبے کا ۴۴ فیصد جو قدرتی وسائل اور طویل ساحلی پٹی کی دولت سے مالا مال ہے کہا جاتا ہے کہ پاکستان کی معاشی واقتصادی زندگی کا دارومدار ان ہی وسائل پر ہے۔ پاکستان میں قدرتی گیس کا زیادہ تر حصہ سوئی کے مقام سے حاصل کیا جاتا ہے جو پاکستان کی ضرورت کو پورا کرتا ہے اس کی اہمیت اس وقت بڑھ گئی جب گوادر کو بین الاقوامی پورٹ بنانے کا کام شروع ہوا یہ حصہ ساحل خلیج فارس کے دہانے پر واقع ہونے کی بدولت جنوبی ایشاء، مشرقی وسطیٰ اور وسطِ ایشیاء کے مابین تجارت اور دفاعی ضروریات کے لیے ازحد لازمی ہے۔

صوبہ بلوچستان پاکستان کا وہ حصہ ہے جو انتہائی پس ماندہ اور مفلوک الحال ہے جو اپنی آزادی و بقا کی جنگ کی خاطر ہمیشہ جبر اور عدم استحکام کا شکار رہا۔ سیاسی حیثیت میں شروع سے ہی مرکزی وصوبائی ایوانوں میں بلوچ نمائندگی نہ ہونے کے برابر رہی۔ رہی سہی کسر مارشل لاء دور میں سیاسی رہنماؤں کی گرفتاری سے پوری ہوئی۔ ۱۹۴۷ء کے بعد سے اقتدار کے ایوانوں نے طاقت کے بل بوتے پر بلوچستان کے عوام کے جائز حقوق کا استحصال کیا اور بغاوت پر اُکسایا حالانکہ بلوچ رہنماؤں نے سب سے پہلے پاکستان کے حق میں ووٹ دیا۔ اگر دیکھا جائے تو بلوچ مسئلہ محض پاکستان کی وفاقی حکومت سے صوبائی خودمختاری میں اضافے یا بعض مراعات کا حصول نہیں ہے بلکہ یہ ایک دیرینہ قومی تحریک ہے جس کا آغاز پاکستان بننے سے کافی پہلے ہوا تھا۔ اس مسئلہ کی بنیاد انگریزوں کی آمد سے پڑی تھی، اس سے قبل ریاست قلات آزاد تھی، اس کی حیثیت ایک ٹرائبل کنفیڈریسی کی تھی اور دنیا میں یہ پہلی کنفیڈریسی تھی۔ انگریزوں کی یہاں آمد کا مقصد روس کے توسیع پسندانہ عزائم کو ناکام بنانا اور اسے بلوچستان کے گرم پانیوں تک رسائی سے روکنا تھا۔ اس مقصد کے لیے ان کی نظر افغانستان پر تھی جبکہ بلوچستان کے بغیر افغانستان تک پہنچنا ممکن نہ تھا چنانچہ انگریزوں نے خان قلات سے پہلا باضابطہ عہد

نامہ مستونگ کے عنوان سے ۱۸۳۷ء میں کیا۔۱۸۹۱ میں انہوں نے گولڈ اسمتھ لائن کے ذریعے بلوچستان کو تقسیم کر کے اس کا ایک لاکھ مربع میل کا علاقہ ایران کے حوالے کر دیا (۴)۔اور یہ حقیقت ہے کہ بلوچ قوم کا ایران اور افغانستان کے ساتھ سرحدوں کا ملنا ہی بلوچ قوم میں تنازعات کی بنیادی وجہ ہے۔جیسے ایرانی بلوچستان کی حیثیت ایک نیم خودمختار ریاست کی سی تھی اور اس پر بلوچوں کا بارانزئی خاندان حکمران تھا۔انگریزوں کی حد بندیوں اور ریاستوں کی بندر بانٹ سے ایران کے اندر بلوچ مسئلہ پیدا ہوا ایران اور بلوچوں کے تنازعے نے طویل عرصے تک اس علاقے کو متاثر کیے رکھا اور یہ ابھی تک کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے۔

انیسویں صدی میں انگریزی حکومت نے انتظامی اعتبار سے مشرقی بلوچستان کو دو جغرافیائی حصوں میں تقسیم کیا جس میں برٹش بلوچستان اور ریاستی بلوچستان شامل ہیں۔برٹش بلوچستان پشتون قبائلی علاقوں کے علاوہ مری بگٹی قبائلی علاقے پر محیط تھا۔جہاں سے ریلوے لائن اور وہ فوجی شاہراہیں گذرتی تھیں جو برصغیر پاک و ہند کو افغانستان اور ایران سے ملاتی تھیں۔جبکہ ریاستی بلوچستان قلات، لس بیلہ، خاران اور مکران کی ریاستوں پر مشتمل تھا۔خان قلات اپنے ماتحت سرداروں کے ذریعہ حکومت کرتا۔معاہدہ مستونگ کے انتظامی ڈھانچہ نے سرداروں کو زیادہ بااختیار بنا دیا تھا۔کہا جاتا ہے کہ خان قلات اصولاً تو خودمختار حاکم تھا مگر ہر بنیادی معاملے میں انگریز ریزیڈنٹ اور ایجنٹ برائے گورنر ہی فیصلے کا مجاز تھا۔ویسے یہ فیصلے خان قلات کے نام سے ہوتے اور خان کی اس خاموشی کے بدلے ہند کی انگریز سرکار سے وظیفہ اور امداد ملتی (۵)۔ایک معاہدہ کی رو سے برطانوی حکومت نے واضح کیا کہ ''برطانیہ کی جانب سے قلات کی آزادی اور حاکمیت اعلیٰ کا احترام کیا جائے گا۔'' (۶) چونکہ برطانیہ کی حکومت نے بلوچستان پر قبضے کے بعد واضح طور پر کہا تھا کہ وہاں کے قبائلی علاقوں کے سرداروں کی حاکمیت کو تسلیم کیا جائے گا اور بلوچستان کی آزادی کو کسی قسم کی گزند نہیں پہنچے گی۔جب برصغیر سے انگریزوں کی واپسی ہوئی تو وہاں کی سیاسی جماعتوں نے، جن میں انجمن اتحاد بلوچستان اور قلات اسٹیٹ نیشنل پارٹی نے آزاد بلوچستان کو اپنی منزل قرار دیا۔خان قلات میر احمد یار خان بھی اسی نقطۂ نظر کے حامی تھے۔

۳ جون ۱۹۴۷ء کو جب ہندوستان کی تقسیم کا منصوبہ بنا تو اس میں پریس سے خطاب کرتے ہوئے ماؤنٹ بیٹن نے کہا کہ ''ہندوستانی ریاستوں کی حیثیت آزادانہ ہے اور یہ کہ اقتدارِ اعلیٰ ختم ہونے کے ساتھ ہی ان کی حیثیت آزادانہ ہوگی اور وہ کسی ایک یا دوسری دستور ساز اسمبلی کے ساتھ تعلق قائم کرنے یا کوئی دوسرا انتظام کرنے میں مکمل طور پر آزاد ہوں گی۔'' (۷) دوسری جانب پاکستان نے بھی ۱۱/اگست ۱۹۴۷ء کو قلات اور بلوچستان کی آزاد حیثیت کو تسلیم کرتے ہوئے کہا کہ ''حکومت پاکستان اس پر متفق ہے کہ قلات ایک آزاد ریاست ہے، اس کی حیثیت ہندوستان کی دوسری ریاستوں سے یکسر مختلف ہے، جیسا کہ برطانوی حکومت کے ساتھ اس کے مختلف سمجھوتوں سے ظاہر ہے وہ اپنے ان تعلقات کی پاسدار ہے۔'' (۸) جب بلوچستان کی آزاد ریاستوں کا پاکستان کے ساتھ الحاق کا وقت آیا تو قائداعظم محمد علی جناح جو ۱۹۴۰ء سے

خان قلات میر احمد یار خان سے ریاست قلات کی آزادی کے سلسلے میں ایک مقدمہ میں مدد کے سلسلے میں دیرینہ دوست بن گئے تھے، اس وقت خان قلات نے اپنی ریاست کی تمام دستاویزات اور انگریزوں سے کیئے گئے معاہدے ان کے حوالے کر دیئے تاکہ وہ ریاست قلات کی خود مختاری کی بحالی کا مقدمہ حکومت برطانیہ کے سامنے پیش کریں۔ خان قلات اور قائداعظم کے یہ تعلقات رفتہ رفتہ ذاتی تعلقات میں تبدیل ہو گئے لیکن ریاست قلات کی پاکستان کے ساتھ الحاق کی بات آئی تو احمد یار نے انکار کر دیا جبکہ اس سے پہلے وہ کہہ چکے تھے کہ ''اس نصب العین کے تحت اور اس عہد و پیمان پر ایک دیانتدار بلوچ کی طرح یقین کر کے ہم نے مسلمانانِ ہند کی امداد اور اسلام کی خدمت کے جذبے سے سرشار ہو کر قائداعظم محمد علی جناح اور مسلم لیگ کا ساتھ دیا۔'' (۹) خان آف قلات کے انکار پر محمد علی جناح نے ۲ فروری ۱۹۴۸ء کو احمد یار کو اپنے خط میں لکھا کہ ''آپ کے بہی خواہ کی حیثیت سے میں آپ کو مشورہ دیتا ہوں کہ آپ کسی تاخیر کے بغیر پاکستان میں شمولیت کا فیصلہ کریں۔'' (۱۰) اس سے پہلے قائداعظم محمد علی جناح نے اکتوبر ۱۹۴۷ء میں خان قلات سے ملاقات کی اور ہمدرد اور ان کا بہی خواہ ہونے کے ناطے خان آف قلات سے کہا کہ:

> ''میری مخلصانہ تلقین ہے کہ اپنی ریاست کو پاکستان میں شامل کر دیں اس سے دونوں کو فائدہ ہوگا جہاں تک قلات کے دوسرے مسائل اور مطالبات کا تعلق ہے اُن کا باہمی دوستی کے جذبے سے فیصلہ کیا جائے گا۔'' (۱۱)

خان اعظم نے اپنی کابینہ کے ممبروں سے مشورہ کرنے کے بہانے سے ٹال مٹول کرنا شروع کی تو حکومت پاکستان نے متعدد علاقے تقسیم کر دیے جن میں لسبیلہ اور خاران کو جو کہ قلات کی ذیلی ریاستیں کو تقسیم کر کے پاکستان میں شامل کر دیے گئے اسی طرح مکران جو قلات کا حصہ تھا ۱۷ مارچ ۱۹۴۸ء کو پاکستان کا حصہ بنا دیا گیا اور تین میں سے ایک سردار کو اس کا حکمران بنا دیا گیا (۱۲)۔ جبکہ میر گل خان نصیر کہتے ہیں کہ ''۲۷ مارچ ۱۹۴۸ء کو آدھی رات کے وقت خان معظم نے بہ امر مجبوری پاکستان کے ساتھ قلات کے غیر مشروط الحاق کا اعلان کر دیا۔'' (۱۳) چنانچہ ان اقدامات سے بلوچوں میں غم وغصہ کے ساتھ ساتھ بددلی بھی پیدا ہوگئی۔ اس موقع پر رنج اور احساس ناکامی کے جذبات اُبھرے اس سے پہلے کے بلوچ اپنے غم وغصہ کا اظہار کرتے حکومتِ پاکستان کو خبر ہوئی اور اس نے فوجی کارروائی کا فیصلہ کر لیا جنرل اکبر خان کو جو کوئٹہ میں تعینات تھے، قلات میں پیشقدمی کا حکم ملا تو اپریل ۱۹۴۸ء میں قانونی طور پر ہونے والی فوجی کارروائی نے مکمل کیا اس کے بعد خان آف قلات کے پاس دوسرا کوئی اختیار نہ رہا کہ وہ پاکستان کے ساتھ الحاق کرے اور یوں قلات فوجی طاقت سے پاکستان میں شامل کر لیا گیا۔ اس کے بعد بلوچ رہنما روپوش ہوگئے اور جو ملے وہ فوجی کارروائی میں گرفتار کر لیے گئے۔ اس کے برعکس ان کے بیٹے پرنس عمر نے کہا کہ ''میرے والد کو حضور ﷺ کی جانب سے بشارت آئی کہ ایک اسلام کے نام لیوا ملک کے ساتھ الحاق کر لو یوں انہوں نے قائداعظم کی بات مان کر پاکستان کے حق میں ووٹ دے دیا۔'' (۱۴) یوں

بلوچستان میں مزاحمتوں کا سلسلہ شروع ہوگیا بلوچوں نے اپنی آزادی کے لیے منظّم اور منصوبہ بندی کے تحت پاکستان کے خلاف مزاحمت شروع کردی سب سے پہلی مزاحمت پاکستان کے ساتھ الحاق کے خلاف خان آف قلات کے چھوٹے بھائی پرنس عبدالکریم بلوچ نے کی جو مکران کے گورنر تھے انہوں نے بغاوت کردی اور مارچ ۱۹۴۸ء میں اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ افغانستان چلے گئے اور سرحد پر سرلٹھ کے مقام پر مقیم ہوگئے پرنس کریم کو امید تھی کہ افغانستان اور سوویت یونین ان کی مدد کریں گے لیکن انہوں نے سرد مہری کا مظاہرہ کیا۔کچھ عرصے بعد پرنس کریم اپنے ساتھیوں کے ساتھ واپس آگئے۔ انور ساجدی امریکی مصنف سلیگ ہیری سن کا حوالہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ پاکستان کی جانب سے دھمکی کے بعد خان آف قلات نے اپنے بھائی پر زور دیا کہ وہ واپس آجائیں انہیں نے یقین دلایا کہ حکومت پاکستان انہیں کچھ نہیں کہے گی۔ اس کے علاوہ ایک اور اطلاع تھی کہ پرنس کریم اور ان کے ساتھی ہربوئی کے پہاڑوں میں آکر روپوش ہوگئے جہاں پاکستانی حکام نے ان کے ساتھ ایک معاہدہ کیا تھا اور قرآن کو ضامن بنا کر عہد کیا گیا تھا کہ معاہدے کی پاسداری کی جائے گی مگر جب پرنس کریم ہربوئی سے نیچے آئے تو انہیں ایک سو پچیس ساتھیوں کے ہمراہ گرفتار کرلیا گیا(۱۵)۔یوں ''یہ اعتماد کی شکست اور ٹوٹتے عہد ناموں کا پہلا اظہار تھا۔''(۱۶)اس کے بعد پرنس عبدالکریم کو ۱۰ سال قید با مشقت اور بھاری جرمانہ کی سزا عائد کردی گئی اور باقی ۱۲۵افراد کو ایک سال سے ۷ سال تک کی معیاد کی سزائیں سنائی گئیں۔یوں پرنس کریم کی بغاوت معمولی نہ تھی۔یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ بلوچ قومی امنگوں کو ایک نئی راہ مل گئی بلوچ تحریک کی جدوجہد میں آنے والے دنوں میں دوسری مزاحمتوں نے اپنا حصہ ڈالا۔

بلوچستان کی تحریک آزادی کے لیے دوسری مزاحمت اس زمانے میں ہوئی جب مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے صوبوں کو ون یونٹ میں تبدیل کردیا گیا۔لیکن یہ تبدیلی صوبوں کو قابل قبول نہ تھی اگرچہ ون یونٹ بنگال کی اکثریت کو توڑنے اور دونوں حصوں کو مساوی حقوق دینے کی غرض سے یہ اقدام کیا گیا تھا۔لیکن اس سے صوبوں کی خودمختاری پر ضرب پڑتی تھی اس سلسلے میں بلوچ سرداروں اور سندھ کے زمینداروں نے احتجاج کیا جس کی کہیں سنوائی نہ ہوئی۔ ۱۹۵۵ء میں پرنس کریم کی سزا ختم ہوئی تو وہ بھی ون یونٹ کے خلاف ہوگیا اور متحدہ بلوچستان کا مطالبہ کردیا۔ ۱۸ اکتوبر ۱۹۵۷ء کو بلوچستان اور سندھ کی جانب سے ایک وفد صدر اسکندر مرزا سے ملا اور اپنے مطالبات ان کے سامنے رکھے لیکن ایک سال بعد ہی ۶ اکتوبر ۱۹۵۸ء کی صبح کو جب قلات کے لوگ نیند سے بیدار ہوئے تو انہوں نے دیکھا کہ پورا شہر فوج کے گھیرے میں ہے، کوئٹہ سے قلات تک پورے سو میل کی سڑک پر فوج ہی فوج نظر آرہی تھی(۱۷)۔ایوب خان نے اپنی کتاب میں اس کا ذکر اس طرح کیا کہ ''خان قلات علیحدگی کی سازش کر رہا تھا اور اس نے قلات میں اپنی رہائش گاہ پر پاکستانی پرچم اتار کر اس کی جگہ قلات کا پرچم لہرا دیا تھا۔اس عمل پر جب خان کی گرفتاری کی کوشش کی گئی تو اس کے محل کے اندر سے پاکستانی اہلکاروں پر فائرنگ کی گئی بہرحال مارشل لاء کے نفاذ کے ساتھ ہی میر احمد یار خان کو گرفتار کرلیا گیا۔''(۱۸) یوں بلوچ جدوجہد کے ایک

نئے مرحلے میں داخل ہو گئے۔احمد سلیم ،سلیگ ہیری سن کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''جس طرح حکومت نے بیان کیا اس بغاوت کی وسعت اتنی ہمہ گیر نہیں تھی۔''(۱۹) زہری قبیلے کے سردار نواب نوروز خان نے اس پر بطور احتجاج پہاڑوں کا رُخ کیا اور اپنے ساتھیوں کے ہمراہ زہری کے دشوار گزار پہاڑوں کی چوٹی میر گھٹ گئے۔۸/اکتوبر ۱۹۵۸ء کو ایک بڑے آپریشن کا آغاز ہوا جس میں نوروز خان کی املاک کو نقصان پہنچا۔نوروز خان جو کہ نوے سال کے تھے، نے ۱۰۰ افراد کے ساتھ پہاڑوں میں روپوش ہوئے اور وہیں سے بغاوت کر دی۔۱۹۶۰ء کے اوائل میں سرداروں کا وفد بھیج کر نوروز خان کو پہاڑوں سے نیچے اُتارا گیا۔بلوچوں نے الزام لگایا کہ قرآن کو ایک بار پھر ضامن بنا کر یقین دلایا گیا کہ انہیں کوئی گزند نہیں پہنچائی جائے گی لیکن جونہی نوروز خان پہاڑوں سے اترے انہیں گرفتار کر لیا گیا(۲۰)۔اس زمانے میں فوجی آپریشن کے انچارج جنرل ٹکا خان تھے جو بعد میں پاکستانی فوج کے سربراہ ہوئے۔احمد سلیم کے مطابق گرفتار بلوچ مزاحمت کاروں کو قلی کیمپ پہنچا دیا گیا جہاں ۱۲۰۰ سو افراد قید تھے۔کچھ عرصے بعد نوروز خان اور قریبی عزیزوں کو مچھ جیل میں منتقل کیا گیا وہاں سے انہیں حیدرآباد جیل لے جایا گیا۔حیدرآباد جیل کے اندر چلائے گئے غداری کے مقدمہ میں ۹۰ سالہ نوروز خان کو عمر قید جبکہ انکے بیٹے سمیت سات عزیزوں کو موت کی سزا سنائی گئی۔بلوچ روایات کے مطابق نواب نوروز کا بیٹا اور پانچ دوسرے ''بلوچستان زندہ باد'' کا نعرہ لگاتے ہوئے تختہ دار چڑھ گئے،ان میں سے ایک شخص نے اپنی گردن کے ساتھ قرآن مجید باندھا ہوا تھا،ان کا کہنا تھا کہ ہماری پھانسی کے ساتھ قرآن کو بھی پھانسی ہو جائے گی کیونکہ حکومت نے قرآن پر عہد کر کے اسے توڑا ہے۔نوروز خان کو عمر قید کی سزا ملی تھی وہ اسی دوران کوہلو کے قید خانے میں چل بسا(۲۱)۔

مزاحمت کا تیسرا مرحلہ اس وقت آیا جب ۱۹۶۱ میں بنیادی جمہوریتوں کے تحت مرکزی وصوبائی اسمبلیوں کے عام انتخابات ہوئے۔بلوچوں کو اس سے کوئی غرض نہیں تھی کہ فوجی حکومت کیا کر رہی ہے ان کو تو آزاد بلوچستان چاہیے تھا۔انتخابات سے پہلے تک قبائلی عوام کو سخت مشکلوں اور مصیبتوں سے گزرنا پڑا تھا۔احمد سلیم خان آف قلات میر احمد یار کا حوالہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ ''چھوٹے بڑے،نواب،مزدور، چرواہے کی کوئی تمیز روا نہ رکھی گئی۔سبھی کے لیے زندگی مشکل بنا دی گئی لوگوں کا پیمانہء صبر لبریز ہو چکا تھا اس دار و گیر نے شورش اور احتجاج میں مزید اضافہ کر دیا۔''(۲۲) ان مشکل حالات میں ۱۹۶۱ء کے بعد مری علاقہ میں میر شیر محمد عرف شیرو مری کی قیادت میں مری قبائل نے گوریلا جنگ شروع کر دی۔۶ نومبر ۱۹۶۲ء کو خان قلات رہا کر دیئے گئے اور ان کے سارے سابق اعزازات بحال ہو گئے لیکن یہ بھی مسئلے کا حل نہ تھا۔ پراری تحریک (فراری تحریک)(۲۳) نے فوج کی مسلسل موجودگی اور فوجی اقدامات میں وسعت کے پیش نظر اپنی چھاپہ مار کاروائیاں شروع کر دیں پراریوں نے اپنی جدوجہد کا طریقہ وہی رکھا جو حر گوریلا تحریک کے پاس تھا یعنی فورسز سے براہ راست ٹکراؤ کے بجائی Hit and Run اس کے تحت انہوں نے راستوں اور ٹرینوں پر حملوں کے ساتھ ساتھ کہیں کہیں چھوٹی چوکیوں پر بھی حملے کیئے۔

۶۳۔۱۹۶۲ء میں شیر محمد مری اور ان کے بیس کے قریبی رفقاء نے اپنی تحریک کو دوام بخشا اور اس طرح انہوں نے پینتالیس ہزار مربع میل کے علاقہ میں بائیس کے قریب اپنے کیمپ قائم کر لیے جس میں وہ چھپ کر گھات لگا کر فوج پر حملہ کرتے ،ٹرینوں کو بموں سے اڑاتے اور پولیس پر فائرنگ کرتے۔ دوسری جانب فوج نے ہوائی حملے کیے جسکی وجہ سے عام لوگوں کی حمایت چھاپہ ماروں کے لیے بڑھتی گئی (۲۴)۔اس کے علاوہ جھالاوان میں سردار عطاء اللہ خان مینگل کے علاقے میں لوگوں نے پہاڑوں کا رُخ کیا۔انور ساجدی سردار عطاء اللہ مینگل کا حوالہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ ’’یہ بغاوت اس وقت شروع ہوئی جب مارشل لاء حکام نے مینگل قبیلہ کے لوگوں سے کہا کہ وہ اپنے ہتھیار جمع کروادیں لیکن کسی نے ہتھیار جمع نہیں کروائے اس طرح ایک ایسی بلوچ مزاحمت منظّم ہوئی جس کا دائرہ کوہلو سے لیکر بیلہ تک وسیع تھا‘‘(۲۵) سلیم احمد لکھتے ہیں کہ ’’فوج نے شیر محمد مری اور اس کے رشتہ داروں کے تیرہ ہزار ایکٹر پر پھیلے ہوئے بادام کے درختوں کو بلڈوزر پھیر کر جڑوں سے اُکھاڑ دیا۔ یہ باغات مری باغات والے سب سے زرخیز علاقے میں سے تھا۔اس اقدام کے نتیجہ میں دسمبر ۱۹۶۴ء میں ایک بڑے تصادم کے شعلے بھڑک اُٹھے جب پانچ سو پراریوں نے ایک فوجی کیمپ پر دھاوا بول دیا‘‘(۲۶) جنرل ٹکا خان کو’بلوچستان کا قصائی‘ کہنا شروع کر دیا گیا ان حالات واقعات سے دونوں جانب بھاری نقصان اُٹھانا پڑا اور عوام میں غم وغصہ عروج پر پہنچ گیا۔ان اقدامات نے فوجی حکومت کے خلاف شدید نفرت اور علیحدگی کی تحریک نے شدت اختیار کرلی۔یہ مسلح تصادم ۱۹۶۹ء تک ہوتے رہے جب جنرل یحییٰ خان نے ون یونٹ توڑنے کا اعلان کیا اور چھاپہ مار تحریک کے لوگوں کو اپنی کاروائیاں بند کرنے پر آمادہ کرلیا۔

یوں تو یہ مزاحمتیں مارشل لاء ادوار میں پوری شدت سے ابھریں لیکن عوامی دور میں ایک وقت ایسا آیا جب سابق وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو سے شدید اختلافات کی وجہ سے بلوچستان میں ایک بار پھر شورش شروع ہوگئی۔اس بات سے قطع نظر کہ بلوچ سرداروں کے ساتھ یحییٰ خان کے مذاکرات کس حد تک کامیاب ہوئے البتہ ۱۹۷۰ء کے الیکشن میں سردار عطاء اللہ مینگل نے نیشنل عوامی پارٹی کے پلیٹ فارم سے الیکشن لڑا اور بلوچستان میں اسے ۲۰ میں سے ۱۱ نشستیں ملیں جن میں ۳ نشستیں نواب اکبر بگٹی کے حمایت یافتہ امیدواروں نے حاصل کی تھیں۔

مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد ذوالفقار علی بھٹو نے عنانِ حکومت سنبھالی تو ۱۲ مئی کو ۱۹۷۲ء کو سردار عطاء اللہ مینگل کو بلوچستان میں حکومت بنانے کی دعوت دی۔ میر غوبخش بزنجو گورنر مقرر کر دیئے گئے۔لیکن کچھ اس طرح کے حالات پیدا ہوگئے کہ ذوالفقار علی بھٹو اور سردار عطاء اللہ مینگل کے تعلقات میں رنجشیں پیدا ہوگئیں،جس کی بناء پر ۱۵ فروری ۱۹۷۳ء کو سردار عطاء اللہ مینگل کی حکومت کو برطرف کر دیا گیا اور نواب اکبر بگٹی کو گورنر بنا کر صوبے میں گورنر راج نافذ کر دیا گیا۔اسی عرصے میں ذوالفقار علی بھٹو نے ایران کا دورہ کیا جس میں شاہ ایران رضا شاہ پہلوی نے ایرانی سرحد کے قریب بلوچی علاقے کی صورتحال پر تشویش ظاہر کی اور خبردار کیا کہ ایرانی سرحد کے قریب بلوچ قوم پرستوں کی کوئی تحریک نہیں ہونی

چاہیے۔شاہ ایران نے اس دورے میں ذوالفقار علی بھٹو کو ۲۰۰ ملین ڈالر کی فوجی اور اقتصادی امداد بھی دینے کا اعلان کیا۔ ذوالفقار علی بھٹو ایران سے وطن واپس پہنچے تو انہوں نے بلوچستان کی حکومت ختم کردی اور جواز پیش کیا گیا کہ اسلام آباد میں عراقی سفارت کار کے گھر سے سویت ساختہ ۳۵۰ بندوقیں اور ایک لاکھ ایمونیشن برآمد ہوئے اور یہ بھاری اسلحہ بلوچستان بھیجا جانے والا ہے(۲۷)۔ذوالفقار علی بھٹو نے نہ صرف حکومت برطرف کی بلکہ بلوچستان میں فوجی کارروائی شروع کردی اور نیشنل عوامی پارٹی کے رہنماؤں کو گرفتار کرنا شروع کردیا۔سردار مینگل کی برطرفی اور نیپ کے رہنماؤں کی گرفتاری سے بلوچستان میں غم وغصہ کی لہر دوڑ گئی۔شروع میں نیشنل عوامی پارٹی کی قیادت نے ذوالفقار علی بھٹو کے انتہائی اقدام کے خلاف سیاسی مہم چلائی لیکن قیادت کی گرفتاری کے بعد معاملہ اُلٹ گیا۔منتخب صوبائی حکومت کے خاتمے کے بعد صوبہ خانہ جنگی کا ماحول پیش کررہا تھا صوبے میں فوج کشی کی گئی جہاں احتجاج کرنے والے قبائیلوں کو دبانے کے لیے فضائیہ استعمال کی گئی۔ اس سلسلے میں ایران نے پاکستانی حکومت کی مدد کی جس میں ایران کی جانب سے ہمدردی کے ساتھ عملی تعاون کی پیش کش کی گئی اس بارے میں ڈاکٹر جعفر احمد نے شرق اوسط کے امور کے برطانوی ماہر فریڈ ہالیڈے کی کتاب ''ایران آمریت اور ترقی'' کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ ''بلوچستان میں مخالف قوتوں کو کچلنے کے لیے پاکستان کی مرکزی حکومت کو شہنشاہ ایران کی حمایت اور تائید ہی نہیں بلکہ عملی تعاون بھی حاصل تھا اور اس مقصد کے لیے ایران نے تیس کے قریب شنوک ہیلی کاپٹر گن شپ فراہم کئے تھے۔''(۲۸) اس بارے میں سردار عطاء اللہ مینگل صاحب نے کہا کہ ''شاہ کے ہیلی کاپٹر تو ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے ایرانی خود ان کو آپریٹ کرتے تھے بلوچستان میں موجود فوج کا بجٹ بھی وہی دیتا تھا۔''(۲۹) عوامی دور میں جلد مری ایریا اور جھالاوان میں قبائل بڑی تعداد میں پہاڑوں پر چلے گئے اس طرح چوتھی مزاحمت کی ابتداء ہوئی یہ جنگ ۱۹۷۵ء تک شدت کے ساتھ جاری رہی۔اس مزاحمت کا حجم ایک لاکھ مربع میل تک پھیلا ہوا تھا۔اسی دوران مزاحمت کاروں اور نیشنل عوامی پارٹی کی گرفتاری عمل میں آئی اور ان پر غداری کا مقدمہ حیدرآباد میں چلا جو مقدمہ حیدرآباد سے جانا جاتا ہے۔فوجی انقلاب کے بعد جنرل ضیاء الحق نے ۵ فروری ۱۹۷۸ء کو نیپ کے رہنماؤں کو رہا کردیا(۳۰)۔جنرل ضیاء الحق نے ان رہنماووں کے ساتھ مذاکرات کیے لیکن نتیجہ لا حاصل رہا لیکن اتنا ضرور ہوا کہ مفاہمت ہوگئی اور لیڈر خاموش ہوگئے اور مزاحمت کا سلسلہ تھم گیا۔کہا جاتا ہے کہ کچھ عرصے بعد نواب خیر بخش مری کی قیات میں مری قبیلہ کے ہزاروں لوگوں نے افغانستان ہجرت کی جس کا مقصد ایک نئی حکمت عملی ترتیب دینا تھا۔

پاکستان مسلم لیگ (ق) اور صدر جنرل پرویز مشرف کے دورِ حکومت میں ریاست کا تصور بلوچستان میں اُبھرا تو ڈیرا بگٹی بھی اس زد میں آ گیا۔اس واقعہ نے بلوچستان میں ایک اور مزاحمت کو دعوت دی پاکستان مسلم لیگ (ق) کے جمہوری دور میں بلوچستان میں مزاحمت کی ابتداء ڈیرہ بگٹی میں شروع ہوئی۔اُس وقت مسلم لیگ کے رہنماؤں کے لیے ایک کڑا امتحان تھا حکومت اور نواب اکبر بگٹی میں مذاکرات ناکام ہوئے تو وہ ۲۶ اگست ۲۰۰۶ء کو دوران مزاحمت ہلاک

ہو گئے۔اس تمام واقعہ کے پیچھے کیا محرکات کارفرما تھے اس کا جائزہ لیے بغیر حقائق کا ادارک نہیں ہوسکتا۔فوجی حکومت کی آمد کے بعد ہی سے بلوچستان میں چھوٹی موٹی جھڑپیں جاری تھیں جو قوم پرستوں کی کارروائی قرار دی جاری تھی جس میں نواب اکبر بگٹی کا کوئی اہم کردار نہ تھا۔اسی دوران ڈیرہ بگٹی میں گیس تنصیبات پر حملوں کا بھی سلسلہ شروع ہوا تھا مگر اس کو مقامی بگٹی قبائل کی ملازمتوں کے حوالے سے احتجاج قرار دیا گیا(۳۱)۔حالات میں خرابی اس وقت ہوئی جب یکم جنوری ۲۰۰۵ کو پی پی ایل کی ڈاکٹر شازیہ خالد کے ساتھ نامعلوم افراد نے زیادتی کی۔اگلے روز اس واقعہ پر نواب اکبر بگٹی کی جانب سے شدید ردعمل آیا انہوں نے کہا کہ ''سرزمین بلوچستان پر ایک خاتون کی بے حرمتی کی گئی ہے جو ہمارے لیے ناقابل برداشت ہے۔''(۳۲) اکبر بگٹی نے مطالبہ کیا کہ اس واقعہ کے ذمہ دار افراد کو فوری طور پر گرفتار کیا جائے اور یہ واقعہ ایک مہم کی صورت اختیار کر گیا جس پر پی پی ایل (پاکستان پیٹرولیم لمیٹڈ) اور حکومت دفاعی پوزیشن پر آ گئیں۔احتجاج کرنے والوں کا موقف یہ تھا کہ یہ واقعہ ایسی جگہ پیش آیا جہاں سیکورٹی پر کمانڈوز تعینات تھے اور کوئی غیر متعلقہ شخص کالونی کے اندر داخل نہیں ہوسکتا تھا اور کہا گیا کہ یہ حرکت کسی ایسے شخص نے کی تھی جو خود اس حفاظتی حصار کے اندر مقیم تھا یا وہ کسی بڑی پوسٹ پر تعینات تھا۔اس واقعہ کے بعد نواب اکبر بگٹی نے تواتر کے ساتھ الزام لگایا کہ ڈاکٹر شازیہ کے ساتھ زیادتی کیپٹن حماد نے کی ہے جب یہ معاملہ غیر ملکی میڈیا پر مشتہر ہوا تو حکومت نے ایک جوڈیشل انکوائری کمیٹی مقرر کی جس نے بعدازاں اپنی رپورٹ میں قرار دیا کہ زیادتی کے مرتکب افراد نامعلوم تھے۔بعدازاں اس معاملے پر صدر پرویز مشرف کو قوم سے خطاب کرنا پڑا۔

ڈاکٹر شازیہ کیس بھی ایک سازش تھی جس کا انکشاف اس طرح کیا گیا کہ ''ڈاکٹر شازیہ خالد کیس دراصل گہری سازش کا شاخسانہ تھا جو خود نواب اکبر بگٹی کے گھر میں تیار کی گئی تھی یہ دراصل بلیک میلنگ کا ہتھکنڈہ تھا۔''(۳۳) اس سازش کی حکمت عملی تیار کرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ تقریباً واقعہ سے تین سال قبل بین الاقوامی ماہرین نے حکومت پاکستان کو مشورہ دیا تھا کہ وہ توانائی کی ضروریات پورا کرنے کے لیے اپنے وسائل کو بڑھائے۔اس مقصد کے لیے ایک طرف جوہری صلاحیت سے توانائی حاصل کرنے پر زور دینے کے لیے کہا گیا۔دوسری طرف گیس، زیرزمین پٹرول اور دوسری معدنی ذخائر ڈھونڈنے کے لیے نئے کنویں کھودنے کا مشورہ دیا گیا۔اس مشورے پر عمل کرنے کی خاطر سوئی کے علاقے میں نئے کنویں کھودنے کا فیصلہ کیا گیا۔ان کنوؤں کی کھدائی کے لیے جب کام شروع ہوا تو ڈاکٹر شازیہ خالد کیس منظر عام پر آیا(۳۴)۔یوں علاقے میں متعین سلامتی حکام کے خلاف اس کیس کو اچھالا گیا اور ایسی فضا قائم کردی گئی جس میں نئے کنویں کھودنے اور دیگر ترقیاتی سرگرمیوں کے لیے مشکلات پیدا ہوگئیں۔یوں بلوچستان میں مزاحمت کا آغاز ہوا پہلے ردِعمل کے طور پر ۹ جنوری، ۲۰۰۵ء کو سوئی میں جھڑپیں ہوئیں جس میں دو افراد ہلاک اور متعدد زخمی ہو گئے۔۱۰ جنوری کو سوئی پلانٹ پر راکٹوں کی بارش کی گئی اور اتنے راکٹ فائر کے گئے کہ اس کی مثال موجود نہ تھی۔اس حملے کی وجہ سے عارضی طور پر پلانٹ کو بند کر دیا گیا اور ملک کے بالائی علاقوں کو گیس کی فراہمی معطل ہوگئی فائرنگ کے تبادلے میں چار افراد ہلاک

ہو گئیے۔گیس پائپ لائنوں کو تباہ کیا جارہا تھا حالانکہ نواب اکبر بگٹی پچاس کے عشرے سے سوئی کے قدرتی گیس کے کنوؤں سے حاصل ہونے والی آمدنی کی رائلٹی تواتر سے لیتے رہے ہیں۔اس کے علاوہ گوادر کو بین الاقوامی بندرگاہ بنانے اور میگا پروجیکٹ پر کام شروع کرنے پر مقامی باشندے سخت اضطراب کا شکار ہوئے کیونکہ اگر گوادر انٹرنیشنل بزنس مارکیٹ بنا دیا جائے گا تو دوسرے علاقوں کے لوگ اس میں بسنا شروع ہو جائیں گے اور بلوچوں کی اکثریت ختم ہو جائے گی۔گوادار پورٹ کی اتنی تشہیر کی گئی کے کراچی اور دوسرے علاقوں کے پراپرٹی ڈیلروں نے گوادر کے پلاٹس فروخت کرنے شروع کردیئے جس سے کراچی کے ساتھ ساتھ گوادر کی زمینوں کی قیمتوں میں ہوش ربا اضافہ ہونا شروع ہو گیا۔گوادر کی پراپرٹی کی فروخت کی مخالفت میں بھی نواب اکبر بگٹی پیش پیش رہے جب سیاسی مخالفت بہت زیادہ بڑھ گئی تو حکومت نے مذاکرات شروع کردیئے جو لا حاصل رہے۔

پاکستان مسلم لیگ (ق) نے بلوچستان میں جاری کشمکش کو دور کرنے کے لیے مذاکرات پر زور دیا۔مسلم لیگ (ق) کے صدر چوھدری شجاعت اور مشاہد حسین نے نواب اکبر بگٹی کے ساتھ مذاکرات کی راہ اپنائی۔یہ مذاکرات تین سطحوں پر ہوئے ان میں سے ایک آئینی امور کا احاطہ کرنے کے لیے قائم کردہ کمیٹی کے ذریعے جاری رکھے گئے اس کی سربراہی سینٹ میں قائد ایوان اور سر برآوردہ ماہر و قانون بیرسٹر وسیم سجاد کر رہے تھے جبکہ دوسری سطح کے مذاکرات کے لیے اس کمیٹی کو مامور کیا گیا جس کی سربراہی حکمران پاکستان مسلم لیگ کے سیکریٹری جنرل، مشاہد حسین سید کو تفویض ہوئی تھی۔تیسری سطح کے مذاکرات جنہیں در پردہ رکھا گیا بیک چینل رابطے تھے۔مشاہد حسین نے کہا کہ ''حکومت اور بلوچ سرداروں کے درمیان ۳۳ میں ۳۰ نکات پر باہمی رضامندی ہو چکی تھی کہ بلوچستان میں تعینات فورس پر جنگجوؤں کے حملے شروع ہو گئے اور مذاکرات سبوتاژ ہو گئے (۳۵)۔لیکن حکومت کی جانب سے نواب اکبر بگٹی کے خلاف کارروائی میں شدت اُس وقت آئی جب صدر پرویز مشرف نے بلوچستان کا دورہ کیا اور جلسہ سے خطاب کر رہے تھے کہ ان کے جلسہ سے تھوڑی دور راکٹ آکر گرا جس سے جانی نقصان نہ ہوا لیکن صدر جنرل پرویز مشرف نے بلوچستان میں کارروائی کرنے کا عزم کر لیا۔

نواب اکبر بگٹی کی ہلاکت سے ایک دن پہلے گرینڈ جرگہ کے نام سے جناح گراؤنڈ میں سرداروں جن میں کلپر، میسوری اور دوسرے قبائل سرداروں نے شرکت کی جس میں سرداروں نے پاکستان سے وفاداری کا عہد کیا، تمام انتقامی کاروائیاں بند کرنے کا فیصلہ کیا، نوابی و سرداری نظام کے خاتمے، خریدی ہوئی یا خون بہا میں حاصل کی ہوئی عورت کا نکاح کوئی مولوی نہیں پڑھائے گا اور اگر کسی نے خلاف ورزی کی تو اس پر بھاری جرمانہ عائد کیا جائے گا۔نواب اکبر بگٹی اور ان کے پوتوں کو بگٹی قوم کے حوالے کیا جائے تاکہ ان سے بدلا لیا جا سکے اور نواب اکبر بگٹی کی منقولہ و غیر منقولہ جائداد فروخت کر کے مظلوموں میں تقسیم کی جا سکے۔لیکن اس کی نوبت ہی نہ آئی دوسرے ہی دن ۲۶ اگست، ۲۰۰۶ کو پاکستان کی سیکیورٹی فورس نے نواب اکبر بگٹی کو سٹیلائیٹ سے نشاندہی پر نشانہ بنایا جس میں اکبر بگٹی کے ۲ پوتوں سمیت ۳۰ قبائلی ہلاک ہو گئے

جس میں کہا گیا کہ کیمیائی ہتھیار استعمال کیا گیا لیکن حکومت نے اس کی تردید کردی۔حکومت کے مطابق اکبر بگٹی غار میں تودہ گرنے سے ہلاک ہوئے۔اس حوالے سے تجزیہ نگار ارشاد احمد حقانی کہتے ہیں کہ:

''حکومت کے اکابرین نے جب بھی بات کی طاقت کے استعمال کی بات کی۔صدر پرویز مشرف نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ بلوچ سردار پرانے زمانے میں رہ رہے ہیں انہیں پتا نہیں ہے کہ جدید زمانے میں کس کس طرح کے ہتھیار تیار کیے جا چکے ہیں جو پاکستان کی مسلح افواج کی تحویل میں ہیں اور ان بلوچ سرداروں کو ایسے ہتھیاروں سے ہلاک کیا جائے گا کہ انہیں پتا بھی نہیں چلے گا کہ ان پر کس طرف سے اور کس قسم کے ہتھیار کے ساتھ حملہ ہوا ہے۔'' (۳۶)

صدر پرویز مشرف کے اسی قسم کے بیانات کی وجہ سے یہ قیاس آرائی کی گئی ہے کہ نواب بگٹی کو لیزر گائیڈڈ میزائل کا نشانہ بنایا گیا اور یہی ہتھیار ان کی ہلاکت کا باعث بنا۔جبکہ وزیر اطلاعات تردید کرتے رہے کہ ایسا کوئی میزائل نہیں داغا گیا۔پاکستان مسلم لیگ حکومت اس حوالے سے مذاکرات کرنے پر زور دیتی رہی لیکن صدر جنرل پرویز مشرف کی پوری کوشش تھی کہ یہ مسئلہ جلد از جلد اپنے منطقی انجام کو پہنچے۔جنرل پرویز مشرف متعدد ٹی وی پروگراموں میں اس اقدام کو صحیح گردانتے رہے لیکن تجزیہ نگار ارشاد احمد حقانی کہتے ہیں کہ:

''امر واقع یہ ہے کہ بلوچستان کے مسئلہ کو شروع ہی سے حکومت نے مس ہینڈل کیا ہے اور وہ سمجھ نہیں سکے کہ اصلاح احوال کا طریقہ کیا ہے پاکستان میں رائے عامہ کے متعدد ترجمانوں اور اخباری تبصروں میں بار بار اس بات پر زور دیا جاتا رہا ہے کہ صوبائی خودمختاری کا وسیع تر مسئلہ بالخصوص اس حوالے سے بلوچستان کی شکایات کے معاملات ڈائیلاگ اور مذاکرات کے ذریعے طے کیے جانے چاہیے لیکن افسوس کہ مشرف حکومت نے بھی ان مشوروں پر کان نہیں دھرا۔'' (۳۷)

دوسری جانب پاکستان مسلم لیگ (ق) کے رہنما اور سابق وزیر اعلیٰ چودھری پرویز الٰہی کہتے ہیں کہ:

''نواب اکبر بگٹی کی کچھ باتیں تسلیم کر لی گئیں کچھ باتیں کمیٹی کی مانی گئیں طویل مشاورت کے بعد اس کمیٹی نے اپنی سفارشات پیش کر دی ان سفارشات پر عمل ہو گیا تھا کچھ پر نہیں ہوا میرے نزدیک اگر ان سفارشات پر عمل کر لیا جاتا تو بعد میں جو ابتری پھیلی شاید نہ پھیلتی۔نواب صاحب نہ صرف اسلام آباد آنے کو تیار تھے بلکہ ڈیرہ بگٹی میں بننے والی فوجی چھاؤنی میں بھی اُن کی رضامندی شامل تھی۔تعجب ہوتا ہے کہ اچانک ہی حالات نے پلٹا کھایا اور نواب صاحب کی جان چلی گئی ہم نے اس وقت بھی کہا کہ یہ ایک افسوس ناک واقعہ ہے''۔(۳۸)

حالات و واقعات کو دیکھا جائے تو مسلم لیگ (ق) کے رہنماؤں کی پوری کوشش تھی کہ ڈیرہ بگٹی میں کچھ عرصہ پہلے

شروع ہونے والے نامساعد حالات کو مذاکرات سے حل کیا جائے لیکن نہ جانے وہ کون سے نادیدہ ہاتھ تھے جنہوں نے بجائے مذاکرات کے جنگ و جدل کو دعوت دی جس میں سردار اکبر بگٹی اور ان کے رفقاء اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ پاکستان مسلم لیگ (ق) کی حکومت کے آخری دنوں میں ایک اور ایسا واقعہ آیا پیش آیا جس سے بلوچستان میں غم غصہ کی لہر اُٹھی۔ واقعہ کے مطابق ۱۲ نومبر ۲۰۰۷ کو سیکیورٹی فورسز کے ہاتھوں مزاحمت کے دوران بلوچستان لبریشن آرمی کے سربراہ بالاچ مری ہلاک ہوگئے، جو سیکیورٹی فورسز کو مطلوب تھے (۳۹)۔ اس واقعہ کے بعد بلوچستان میں فسادات پھوٹ پڑے جلاؤ گھیراؤ ہوا اور بلوچستان ایک بار پھر بحران کا شکار ہوگیا۔ اگر دیکھا جائے تو ۱۹۷۰ء میں سردار عطاء اللہ مینگل کے صاحبزادے اور ۲۰۰۷ء میں بالاچ مری کی حکومتی اداروں کے ہاتھوں ہلاکت نے وفاق اور صوبے کے مابین تعلقات کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا اس کے ردِ عمل میں مزاحمت کاروں کے ذریعے غیر بلوچ آباد کاروں جن میں ہزارہ، شیعہ ہزارہ، پختون اور سب سے زیادہ ٹارگٹ کلنگ کا نشانہ بننے والی قوم پنجابی تھے اور ہیں۔ اسی طرح مکران اور خضدار میں بلوچ رہنماؤں کو خفیہ ایجنسیوں کے ساتھ روابط کے شبہ میں ہلاک کیا گیا جبکہ پنجابی اساتذہ بھی ٹارگٹ کلنگ کا نشانہ بنے جن میں بلوچستان ریزیڈینشل کالج کے نائب پرنسپل خالد محمود بٹ، گورنمنٹ کامرس کالج کوئٹہ کے پروفیسر امانت علی، گورنمنٹ پائلٹ سیکنڈری اسکول مستونگ کے استاد جاوید لودھی، بلوچستان یونیورسٹی کے قائم مقام وائس چانسلر پروفیسر صفدر کیانی، جامعہ بلوچستان ہی کے پروفیسر خورشید انصاری اور فضل باری نمایاں نام ہیں (۴۰)۔

بلوچستان کی تاریخ دیکھی جائے تو مظلومیت، جبر، مفلوک الحالی اور جنگ و جدل سے بھری پڑی ہے، تاریخی مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ پاکستان کی حکومت سے بڑھ کر فوجی و سول بیوروکریسی نے بلوچ قوم کو باغی بننے پر مجبور کیا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ بلوچستان میں رہنے والی قوموں نے اپنے مفادات کی تکمیل کے لیے غیر ملکی ہاتھوں میں کھیل کر بلوچستان کو آگ و خون میں دھکیل دیا بلوچستان میں جتنی بھی مزاحمتیں ہوئیں اس میں بلوچ قوموں مری، مینگل، مگسی، بگٹی، تالپر اور دوسری قوموں نے جب بھی بلوچستان میں مزاحمت کی اور افغانستان کوچ کر گئے اور مزید فورس تیار کی۔ ان سرداروں نے کبھی اپنے خطے کی ترقی کے لیے کوئی نمایاں کارکردگی نہیں دکھائی بلکہ کچھ سردار پنی اولادوں کو باہر ممالک سے اعلیٰ تعلیم دلواتے اس حوالے سے ڈاکٹر ارباب کھاوڑ نے بابو جنرل شیروف (شیر محمد خان مری) سے انٹرویو لیتے ہوئے کہتے ہیں کہ ''بلوچستان کے تقریباً ہر علاقے میں، میں گیا ہوں میں نے محسوس کیا ہے خاص طور پر مریوں میں تعلیم کا رجحان ابھی تک کم ہے۔'' اس کے جواب میں بابو جنرل شیروف نے کہا کہ ''اگر مری تعلیم حاصل کریں گے تو وہ بندوق چھوڑ کر بزدل اور مفاد پرست بن جائیں گے۔'' (۴۱) ایسے ہی کچھ نظریات نواب اکبر بگٹی کے تھے جنہوں نے سہیل وڑائچ کو ایک انٹرویو میں کہے جبکہ ان کی اپنی اولاد تعلیم یافتہ ہے۔ جہاں بلوچستان کی تباہ حالی میں انکے مقامی رہنماؤں کا ہاتھ ہے وہاں وفاق پاکستان کی غفلت بھی ہے اب بلوچ قوم کی بدلتی ہوئی سوچ کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ پنجابی رہنماؤں نے بلوچستان کے

حوالے سے غلط سوچ روا رکھی جس نے بلوچ قوم میں نفرت پیدا کی اس حوالے سے سیاستدان ممتاز احمد خان دولتانہ کی خفیہ دستاویز کا ایک فقرہ ابھی تک تازیانے کی حیثیت رکھتا ہے:

''ہمیں سرحد (خیبر پختون خواہ) کی بجلی، سندھ کی زمینیں، اور بلوچستان کی معدنیات درکار ہیں۔ ون یونٹ کے قیام سے ہمیں یہ سب کچھ حاصل ہو جائے گا۔''(۴۲)

ان تمام حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ غلط سوچ دونوں جانب ہے ریاست کے اندر ریاست کے تصور کو ختم ہونا چاہیے اور مرکز کو بھی چاہیے کہ صوبے کے دیرینہ مسائل کو حل کرے اور دوسری جانب بلوچ رہنماؤں کا غیر ملکی ہاتھوں میں کھیلنے کے بجائے اپنے صوبے کی ترقی کی خاطر وفاق پاکستان کے ساتھ تعاون کریں جب ہی بلوچستان میں جنگ وجدل کا ماحول ختم ہو سکتا ہے۔

مراجع وحواشی

(۱) بلوچ، عنایت اللہ۔(۲۰۱۰ء)۔''مسئلہ بلوچستان: ادراک اور تدارک''۔مشمولہ عابد میر (مرتب ومترجم) سلگتا بلوچستان۔کوئٹہ: گوشہء ادب۔ص۱۲　(۲) ایضاً۔ص۱۲　(۳) ایضاً۔ص۱۲

(۴) ساجدی، انور۔(۲۰۰۶ء)۔''نواب اکبر بگٹی کا قتل کیوں کیا گیا؟''۔کوئٹہ: دورِ جدید پبلشرز۔ص۲۹

(۵) کوثر، انعام الحق۔رومان، انور۔(۱۹۹۷ء)۔''بلوچستان آزادی کے بعد (۱۹۴۷۔۱۹۹۷ء)''۔کوئٹہ: مشاورت تعلیمی تحقیق۔ص۷۱

(۶) سلیم، احمد۔(۱۹۹۳ء)۔''بلوچستان، صوبہ مرکز، تعلقات، (۱۹۴۷۔۷۷)''۔لاہور: فرنٹیئر پوسٹ پبلی کیشنز۔ص۱۰

(۷) ایضاً۔ص۱۱

(۸) سلیم، احمد۔(۲۰۱۳ء)۔''آزادی سے صوبائی بے اختیاری تک''۔لاہور: جمہوری پبلیکیشنز۔ص۱۶

(۹) نصیر، میر گل خان۔(۲۰۰۰ء)۔''تاریخ بلوچستان''۔حصہ دوئم۔اشاعت چہارم۔کوئٹہ: قلات پبلشرز۔ص۴۷۹

(۱۰) ساجدی، انور۔(۲۰۰۶ء)۔بحوالہ بالا۔ص۳۰۔۳۱　(۱۱) سلیم، احمد۔(۲۰۱۳ء)۔بحوالہ بالا۔ص۱۷

(۱۲) نصیر، میر گل خان۔(۲۰۰۰ء)۔بحوالہ بالا۔ص۵۶۱　(۱۳) ایضاً۔ص۴۷۹

(۱۴) پرنس عمر (خان آف قلات) انٹرویو۔ٹی وی اینکر مبشر لقمان۔ایکسپریس ٹی وی، http://www.dailymotion.com/video/xoxxzd_azad-balochistan-baloch-liberation-army-zindabaad-wake-up-Balochistan_news، ۱۵، دسمبر، ۲۰۱۵ لوڈ آن

(۱۵) ساجدی، انور۔(۲۰۰۶ء)۔بحوالہ بالا۔ص۳۱　(۱۶) سلیم، احمد۔بحوالہ بالا۔ص۲۲　(۱۷) سلیم، احمد۔بحوالہ بالا۔ص۲۳

(۱۸) خان، ایوب۔(۱۹۶۷)۔''فرینڈز ناٹ ماسٹرز''۔پاکستان: آکسفرڈ یونیورسٹی پریس۔ص۵۷

(۱۹) سلیم، احمد۔بحوالہ بالا۔ص۲۶　(۲۰) ساجدی، انور۔بحوالہ بالا۔ص۳۲،

(۲۱) سلیم، احمد۔بحوالہ بالا۔ص۲۶۔۲۷

(۲۲) خان، میر احمد یار۔(۱۹۹۳ء)۔Inside Baluchistan۔آٹو بائیوگرافی۔کراچی: رائیل بک کمپنی۔بحوالہ سلیم، احمد۔ص۲۹

(۲۳) پراری ہی وہ لفظ ہے جو پینتالیس برسوں کے بعد آج ایک بار پھر بلوچوں کی زبان پر عام ہے پراری، جسے اردو دان ''فراری'' کہتے ہیں بلوچی زبان کے اس لفظ کی معنی ہی بغاوت ہے۔وہ باغی افراد یا گروہ جنہیں بات چیت کے ذریعے کمتر نہیں دکھایا جاسکتا،''پراری'' کہا جاتا ہے) میمن، سہیل۔(۲۰۱۰ء) ''بلوچستان کا بحران اور پراری تحریک کی تاریخ''۔مشمولہ عابد میر (مرتب و مترجم) سلگتا بلوچستان۔بحوالہ بالا۔ص ۲۹

(۲۴) میمن، سہیل۔(۲۰۱۰ء)۔بحوالہ بالا۔ص ۳۰ (۲۵) ساجدی، انور۔ص ۳۳ (۲۶) سلیم، احمد۔ص ۳۱

(۲۷) خلیل، طاہر۔(خصوصی ایڈیشن) ''بلوچستان کے سیاسی، انتظامی اور مالی مسائل''۔مشمولہ روزنامہ جنگ۔۲۸اگست۔۲۰۰۶

(۲۸) احمد، جعفر۔(۱۹۸۸ء)۔کنفیڈریشن۔مطبوعاتِ محمود۔ص ۲۰۱

(۲۹) ایضاً۔ص۲۱۲۔۲۱۳ (۳۰) ساجدی، انور۔ص ۳۵

(۳۱) کاظم، محمد۔(رپورٹ) ''ڈیرہ بگٹی: حالات کب اور کیسے خراب ہوئے؟''۔مشمولہ روزنامہ جنگ۔۲۸اگست۔۲۰۰۶ء

(۳۲) ساجدی، انور۔ص ۹۵

(۳۳) ظافر محمد صالح۔(خصوصی ایڈیشن) ''بگٹی حکومت سے مذاکرات''۔مشمولہ روزنامہ جنگ، ۲۸اگست، ۲۰۰۶ء

(۳۴) ایضاً (۳۵) ایضاً

(۳۶) حقانی، ارشاد احمد۔''اکبر بگٹی کا سانحہ ارتحال، تشویشناک'' مضمرات مشمولہ روزنامہ جنگ۔۲۹مئی۔۲۰۰۷ء

(۳۷) ایضاً

(۳۸) عبداللہ، محمد اصغر۔(۲۰۱۲ء)۔''مسلم لیگ سے مسلم لیگ تک انکشافات و دستاویزات''۔لاہور: نگارشات۔ص ۱۳۴

(۳۹) روزنامہ جنگ۔۲۲نومبر۔۲۰۰۷ء

(۴۰) Ali. "Murder of Teachers in Balochistan". Daily Dawn, May 30, 2010

(۴۱) کھاڑو، ارباب۔(۲۰۱۰ء)۔''بلوچستان کی سیاسی جدوجہد میں متوسط طبقے کا کردار''۔مشمولہ عابد میر (مرتب و مترجم) سلگتا بلوچستان۔بحوالہ بالا۔ص ۴۳

(۴۲) سلیم، احمد۔ص ۱۲۷